محمد مظہر الدین صدیقی

اِنسانیت اسلام سے پہلے

بعثت نبوی کے وقت دُنیا کی سیاسی اور اقتصادی حالت۔ اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس مذہبی۔ سیاسی۔ اقتصادی اور تمدنی ماحول کو مدِ نظر رکھیں، جس کے اندر اسلامی تحریک رونما ہوئی۔ جہاں تک اس زمانہ کی سیاسی حالت کا تعلق ہے اس وقت عرب کے آس پاس دو بڑی زبردست سلطنتیں قائم تھیں یعنی روم اور ایران لیکن ان دونوں پر سیاسی اور اخلاقی زوال طاری تھا۔ ان کی باہمی جنگوں سے مہذب انسانیت کا ایک بڑا حصّہ پامال اور عوام النّاس کا امن وچین رخصت ہو چکا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اس زمانہ کے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ اتنا صحیح اور حقیقت پسندانہ ہے کہ ہم ان کی عبارت کو ہو بہو نقل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"جب ایرانیوں اور رومیوں کو مختلف اقوام پر حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں۔ اور انہوں نے دنیوی زندگی ہی کو اپنا مقصد بنا لیا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھے اور شیطنت ان پر غالب آگئی، تو ان کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ عیش کے دن گزاریں۔ چنانچہ ان میں سے ہر شخص دادِ عیش دینے لگا۔ ان کے اس طرزِ زندگی کو دیکھ کر دُنیا کے ہر گوشہ سے علماء اور سائنس دان ان کے گرد جمع ہونے لگے، جو ان کے لئے سامانِ عیش مہیا کرنے کی غرض سے عجیب عجیب دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کرنے لگے اور نئے نئے اسبابِ زینت کی ایجاد و اختراع میں مصروف ہو گئے۔ سرمایہ پرست اُمراء کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم مالیت کا پٹکا یا کلاہ ہوتا تھا اسے بخیلی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔

ایسے ہی انہوں نے عالی شان سر بفلک محل، اعلیٰ درجہ کے آبزن، نفیس حمام، نظر افروز پائیں باغ، سواری کے نمائشی جانور، خدمت کے لئے خوبصورت غلام اور حسین باندیاں، اپنی زندگی کے لوازم بنا لئے اور مقصدِ حیات صرف یہ سمجھ لیا کہ صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں ہوں۔ جن میں طرح طرح کے کھانے وسیع دسترخوانوں پر چنے ہوں۔ اور وہ لباس فاخرہ پہنے ان پر بیٹھے ہوں۔ غرض ان ملوک ایران و روم کی داستان پاستان کہاں تک بیان کی جائے۔ تم اپنے زمانے کے پادشاہانِ دہلی کی جو حالت دیکھتے ہو، وہی ان ملوکِ ایران و روم کی حالت کا قیاس کرنے کے لئے کافی ہے۔

بادشاہوں اور امیروں کی اس عیاشانہ زندگی سے بہت سے خطرناک معاشی اور معاشرتی امراض پیدا ہو گئے۔ جو حیات معاشری کے ہر شعبہ میں داخل ہو گئے، ان سے نہ شہری محفوظ رہا نہ دیہاتی نہ امیر اور نہ غریب۔ اس ہمہ گیر مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامانِ تعیش کثیر زر و مال صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مال کثیر

کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے کے لگے ہوئے ٹیکسوں میں اضافہ کئے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ گراں بار ٹیکس لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کرکے وصول کئے جاتے تھے۔ اگر وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے تھے، تو ان کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی تھی ....

اس اقتصادی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے سوا لوگ اور کسی امر کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے - چہ جائیکہ سعادت اُخروی کے متعلق سوچ کر سکیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سارے ملک میں ایک شخص بھی نہیں رہتا، جو حصول معاش کی کشمکش یا عیش و عشرت کی دلفریبی سے نکل کر کائنات کی حقیقت اور اخلاقی سعادت کے بارے میں غور و فکر کر سکے۔"

آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

فلمّا عَظمتِ هٰذه المصيبةُ واشتدَّ هٰذا المرضُ سخِطَ عليهم الله والملٰئكة المقربون وكان رضاه تعالٰى فى معالجةِ هٰذا المرض بقطع مادّته فبعث نبيّاً اميًّا صلى الله عليه وآله وسلم لم يخالط العجم والروم ولم يترسم برسومهم وجَعَلَهُ ميزاناً يعرف به الهدى الصالح المرضى عند الله من غير المرضى وانطقه بذمّ عاداتِ الاعاجم وقبح الاستغراق فى الحياة الدنيا والاطمئنان بها ونفث فى قلبه ان يحرّم عليهم رؤس ما اعتاده الاعاجم وتباهوا بها كلبس الحرير والقسى والارجوان والاستعمال اوانى الذهب والفضة وحلى الذهب غير المقطع والثياب المصنوعة فيها والصور وتزويق البيوت وغير ذلك۔ وقضٰى بزوال دولتهم بدولته ورياستهم برياسته وبانّه هلك كسرٰى فلا كسرٰى بعدهٗ وهلك قيصر فلا قيصر بعدهٗ۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد ۱ صفحہ ۱۶)

یعنی جب یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور مرض نے شدت اختیار کرلی تو خدا تعالٰی اور اس کے مقرب فرشتے ناراض ہوئے۔ اس وقت خدا تعالٰی کی مشیت یہ ہوئی کہ اس مرض کا مادہ ہی کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ کیونکہ مرض لاعلاج حد تک بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے خدا تعالٰی نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ جو بالکل اَن پڑھ تھے۔ اور جنہوں نے کبھی ایرانی اور رومی لوگوں سے میل جول نہ رکھا تھا۔ اور نہ ان کی رسم و رواج اور طرزِ معاشرت اختیار کی تھی۔ انھیں رسوم صالح اور غیر صالح کے درمیان تمیز کرنے کا معیار قرار دیا۔ اور ان کی زبان فیض ترجمان سے عجمیوں کی رسموں کی مذمت کروائی۔ اور دُنیاوی زندگی میں انہماک اور اس پر اطمینان کرکے بیٹھ جانے کی خرابی ظاہر کی۔ ان کے دل میں ڈالا کہ جن اخلاقِ فاسدہ اور رسومِ ردّیہ کے عجمی عادی ہیں، اور جن پر وہ فخر و مباہات کرتے ہیں وہ حرام ہیں۔ مثلاً ریشمی لباس، ارغوانی کپڑے، سنہرے اور روپہلے برتن، سنہرے زیور اور ایسے کپڑے جن پر تصویریں بنی ہوں، مکانوں پر نقش و نگار۔ خداوند تعالٰی نے فیصلہ کیا کہ اس نبی کی حکومت کے ذریعہ سے قیصر و کسریٰ کی حکومت کو برباد کردے، اور اس کی لیڈر شپ کے ذریعہ ان کی لیڈر شپ کو ختم کردے۔ چنانچہ اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہوگیا۔ اور پھر کوئی

کسریٰ نہ ہوگا۔ اور قیصر کی قیصریت ختم ہوگئی۔ اور پھر اس کا کوئی جانشین نہ ہوسکے گا۔

ساسانی حکمرانوں کے تحت زردشتی مذہب اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ گیا۔ لیکن اس کی اخلاقیات کو گھن لگ چکا تھا۔ ایران کے مذہبی آتش کدے آباد تھے۔ لیکن دلوں کے آتش کدے بجھ چکے تھے۔ اردشیر اور اس کے جانشین مذہبی یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے زردشتیوں کے سوا سارے مذاہب کی بیخ کنی کے درپے تھے۔ لیکن ان کا مقصد حاصل نہ ہوسکا۔ زمانہ مابعد کے ساسانیوں کے تحت ایرانی سلطنت فرقہ وارانہ نزاعات کی گرم بازاری، حکمرانوں کی عیاشی، اُمراء کے ظلم وستم اور مذہبی طبقات کے غرور وتکبر میں بازنطینی سلطنت سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔ اس کے فرمانرواؤں کو اُلوہیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ وہ اپنی رعایا کی جان و مال اور عزت وآبرو پر پورا پورا اختیار رکھتے تھے۔ عوام بالکل بے زبان اور تمام حقوق سے محروم تھے۔ ان کی حیثیت بالکل غلاموں کی تھی۔

یورپ میں اسپین کی حالت بالخصوص نہایت ابتر تھی۔ امراء جنھیں رومی شہنشاہوں کے تحت تمام اعلیٰ مناصب اور عہدے حاصل تھے ہر قسم کے محصول سے بری قرار دئے گئے۔ یہ لوگ نہایت شاندار محلات میں رہتے اور غلاموں اور کنیزوں کا ایک جم غفیر ان کی مشایعت کیا کرتا تھا۔ ان کا زیادہ وقت حماموں میں گزرتا، جو بد اخلاقیوں کے اڈے بن گئے تھے۔ ان کی دولت وثروت اور اعلیٰ معیار زندگی کے مقابلہ میں عوام الناس کی حالت نہایت شکستہ اور قابل رحم تھی۔ متوسط طبقے اور شہروں اور دیہاتوں کی آزاد آبادی رومیوں کے ظلم وستم سے تنگ تھی۔ غلاموں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ وحشی اقوام کے حملوں نے ملک میں اور زیادہ ابتری پھیلادی۔ اُنہوں نے ہر طرف قتل عام اور تباہی کا بازار گرم کردیا۔ اور ہزاروں عورتوں، بچوں اور پادریوں کو غلام بنالیا۔

رومی سلطنت کی کیفیت اس سے بدتر تھی۔ جان بی فرتھا سکو اپنی کتاب "قسطنطین اعظم" میں لکھتا ہے:"یہ تو ہم پڑھ چکے ہیں کہ فرمانروائے سلطنت کی حیثیت بہ نسبت سابق کے اب بہت بدل گئی تھی۔ اب وہ ایک رومانی امپراطور یعنی مالک جنگ وپیکار یا سلطنت کا سب سے اعلیٰ مبارز نہیں رہا تھا بلکہ محلوں کا بادشاہ ہوگیا تھا۔ ایک مشرقی تخت نشین حکومت کے تکلفات اس میں پیدا ہوگئے تھے۔ عوام کی نظر سے پوشیدہ رہتا تھا۔ سونے اور جواہرات سے مرصع لباس پہنتا تھا۔ اور ہر چہار طرف جاہ وحشم کے سامان موجود رہتے تھے۔ رعایا کو تعلیم ہوتی تھی کہ شہنشاہ کا خیال جب دل میں یا ذکر زبان پر آئے، تو اس کو انسان سے بڑھ کر معظم ومحترم سمجھیں۔ اور جب لوگ اس کے حضور میں حاضر ہوں تو نہایت ادب سے گھٹنے ٹیکتے ہوئے آگے بڑھیں۔

ہر زوال پذیر سلطنت کی مانند رومی سلطنت میں دفتریت کا پھیلاؤ بھی بہت بڑھ گیا چنانچہ وہی مصنف جس کا ہم حوالہ پہلے دے چکے ہیں لکھتا ہے:" ہر ایک ایسے حاکم کے نیچے اہلکاروں کا ایک انبوہ کثیر ہوتا تھا۔ اور یہی انتظام درجہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک کے سررشتوں اور محکموں میں جاری تھا۔ خود مختار بادشاہوں کو مجبوری ہوتی ہے کہ ماتحتوں کی ایک با اختیار اور تربیت یافتہ جماعت (بیوروکریسی) کے ذریعہ ملک پر حکومت کریں۔ اور یہ سلسلہ حکام با اختیار کا ایک ایسے پھیلاؤ کا بھاری چٹان ہوتا ہے جس کے بوجھ میں محصول دینے والی رعایا دبی مرتی ہے۔ کیونکہ اس عظیم الشان انتظام کی عمارت کو سنبھالے رکھنا ان ہی غریبوں کا کام ہوتا ہے۔ رومی بازنطینی سلطنت کے نظام محصول بندی کا ذکر بھی مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"خلاصہ یہ کہ اس سخت محصول بندی سے .... صوبہ جات کے زمیندار اور چھوٹے کاشتکار بالکل ہی فنا ہو گئے...... قسطنطین کے زمانے میں بالخصوص اس کے آخری دورِ حکومت میں اس بات کی شہادت بکثرت موجود ہے کہ صوبجات کے گورنر جس طرح چاہتے تھے رعایا کو لوٹتے تھے۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اجازت تھی کہ جس طرح چاہیں رعایا پر جبر کریں....... ظاہر ہے کہ اس سخت محصول نے رعایا پر بڑی سختیاں کی تھیں۔ ہر ایک علاقے میں جس قدر سرمایہ پس انداز لوگوں کے پاس تھا وہ سب ختم ہو گیا اور کاشتکار بالکل تباہ ہو چلے......

غرض کہ ملکی واصلات، درخریج کا جو طریقہ جاری تھا اور جہاں تک اس کا تعلق اراضی کی بابت مالگزاری سے تھا اس کے وضع کئے جانے کی غرض صرف یہ معلوم ہوتی تھی کہ ہر ایک علاقے کی دولت بالکل کھینچ لی جائے۔ اس سختی کی وجہ سے رعایا میں جات بندی کا طریقہ نکل آیا اور اس طریقہ کی سختیاں خزانہ شاہی کی ضروریات کے مطابق بڑھتی گئیں۔ اور آزاد کاشتکار جو پہلے کسی کے غلام تھے نہ نوکر بالکل ہی بگڑنے لگے۔ جب مفلسی بڑھی تو امیروں کے غلام نہیں تو ادنٰے رعیّت بن کر کاشتکاری کرنے لگے۔ اور یہ ادنٰے پیشہ ان کی جات ہو گئی۔ یہ کاشتکار گو غلام نہ تھے۔ لیکن اپنی نقل و حرکت پر قدرت نہ رکھتے تھے جس وقت ان غریبوں کا حق ملکیّت زمین سے اُٹھ گیا، تو پھر وہ دوسروں کے نوکر اور بندے ہو گئے۔ اس حال میں جو کچھ زمین سے پیدا کرتے تھے اس کا ایک مقررہ حصّہ مالک کو دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں مالک کی سکونت ہوتی وہاں جا کر چند مقررہ ایام تک بیگار میں کام کرتے تھے۔ غرض ان کاشتکاروں کی حالت جن کو کولونس کہتے تھے رفتہ رفتہ ایسے غلاموں کی ہو گئی، جن کو پوری آزادی نہ ملی ہو بلکہ غلامی اور آزادی کی درمیانی حالت میں ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ اب وہ محض سرف (SERF) رہ گئے تھے۔ یعنی ایسے کاشتکار ہو گئے تھے جن کا تعلق کسی طرح زمین سے جس پر وہ کاشت کرتے تھے جدا نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا زمین کے ساتھ اشیائے غیر منقولہ میں ان کا بھی شمار تھا۔ ان کاشتکاروں کی نسبت لکھا جاتا تھا کہ "وہ زمین کے ساتھ شامل ہیں۔" ان غریبوں کو اپنی حالت بہتر کرنے یا اپنی اولاد کی مدد کرنے کا مطلق موقعہ حاصل نہ رہا تھا۔ صرف ایک صورت اس حالت سے نجات کی تھی اور وہ یہ تھی کہ کہیں فوج میں بھرتی ہو جائیں۔"

طبقہ واریت۔ ہندوستان میں جب آریہ حملہ آور پنجاب سے آگے بڑھے تو ان کے مذہبی طبقات نے مفتوحہ آبادی کو الگ تھلگ رکھنے کے لئے نہایت سخت قواعد وضع کئے۔ اگر مفتوحہ آبادی کا کوئی فرد فاتح طبقہ کے کسی شخص کو چھو لیتا تو اس کو مذہبًا ناپاک خیال کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ ذاتوں کے مذہبی رسوم و شعائر شودروں کے لئے بالکل ممنوع تھے۔ شودروں کو یہ اجازت تو ضرور تھی کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی یاد میں قربانیاں کریں لیکن ان مراسم میں کوئی برہمن حصّہ نہیں لے سکتا تھا۔ اور اگر لیتا تو اسے سخت سزاؤں کا مستوجب قرار دیا جاتا۔ اگر کوئی شودر کسی برہمن کو وید پڑھتے سن لیتا، تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسا ڈالا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی برہمن کی نشست پر بیٹھ جاتا تو اسے گرم لوہے سے داغ دیا جاتا۔ کوئی شودر اونچی ذات والوں میں شادی بیاہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ طبقہ اعلیٰ کے کسی فرد کو یہ اجازت تھی کہ وہ شودروں میں شادی بیاہ کرے۔

ایران میں مسلمانوں کے داخلہ سے قبل محصولات کا جو نظام رائج تھا اس سے ایرانیوں کی طبقہ وارانہ ذہنیت صاف عیاں ہوتی

ہے۔ خسرو نوشیرواں کی اصلاحات کے مطابق ایران میں عام آبادی کو دو محصول ادا کرنے پڑتے تھے۔ ایک خراج یعنی محصول زمین دوسرے گزیت یعنی جزیہ۔ لیکن ایران کے سات بڑے خاندان جن میں شاہی خاندان بھی شامل تھا، ان محصولوں سے مستثنیٰ تھے۔ اسی طرح اُمرائے عظام جنہیں بالعظماء کہا جاتا تھا، انہیں بھی دونوں محصولوں سے بری کر دیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ تمام فوجی سپاہی، سرکاری عہدہ دار، آتش کدوں کے نگران کار، مذہب کے نمایندے اور وہ اشخاص جو شہنشاہِ ایران کے شخصی ملازم تھے ان محصولوں کی ادائیگی پر مجبور نہ تھے۔ اس طرح حقوق یافتہ طبقات اور عوام الناس کے مابین ایک گہری خلیج حائل تھی۔ یہ حقوق یافتہ طبقات، حکمرانوں، امیروں، مذہبی پیشواؤں اور نظم و نسق کے کارکنوں پر مشتمل تھے۔

زن و مرد کی عدم مساوات۔ عرب میں اسلام سے قبل عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن دنیا کے دوسرے حصوں کی کیا حالت تھی۔ دُختر کشی کی رسم صرف عرب تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ہندوستان میں بھی اس کا خاصا رواج تھا۔ (امیر علی۔ اسپرٹ آف اسلام۔ مقدمہ صفحہ ۲۸) یہ امر صحیح طور پر نہیں معلوم کہ بیواؤں کو زندہ جلا دینے کی رسم ہندوستان میں کب سے شروع ہوئی۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں اس کا رواج عام تھا۔ عورتوں کو وید پڑھنے کی ممانعت تھی۔ اور اسی طرح وہ دیوتاؤں کی قربانیوں میں بھی حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ عورت کا مقصدِ زندگی صرف یہ تھا کہ وہ عمر بھر شوہر کی چاکری کرتی رہے۔ ہندوستان میں مردوں کی طرح عورتوں کی بھی بہت سی مذہبی برادریاں قائم تھیں۔ یہ غیر شادی شدہ عورتیں آزادی کے ساتھ خانقاہوں میں داخل ہو سکتی تھیں۔ جہاں انہیں باقاعدہ رکن کی حیثیت دی جاتی تھی۔ غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کے اس اختلاط سے خانقاہوں کی فضا بالکل ناپاک ہو گئی تھی اور زناکاری عام تھی۔

ایران میں عورتوں کی حالت کچھ اس سے بہتر نہ تھی۔ ہندوستان میں تو منو کے قوانین کے باعث مردوں اور عورتوں پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد تھیں لیکن ایران میں مرد ہر قسم کی اخلاقی، مذہبی اور قانونی گرفت سے بالکل آزاد تھا۔ اس کی مرضی اپنا آپ قانون تھی۔ وہ خون کے قریب ترین رشتوں میں شادی کر سکتا تھا اور جتنی بیویوں کو چاہتا طلاق دے سکتا تھا۔ عورتوں کو مردوں سے علٰحدہ رکھنے کی رسم صرف ایرانیوں تک محدود نہ تھی۔ آیونی یونانیوں ( ) میں عورتوں کو گھروں میں بالکل مقفل رکھا جاتا تھا اور انھیں کسی حالت میں باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایران میں زمانہ قدیم سے یہ دستور تھا کہ عورتوں کی حفاظت کے لئے مردوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ نیز یونان کی طرح یہاں بھی خواصوں اور داشتہ عورتوں کو رکھنے کا طریقہ عام تھا۔ اسے نہ صرف مذہبًا جائز قرار دیا گیا تھا بلکہ یہ ایرانیوں کی سماجی زندگی کا لازمی خاصہ بن گیا تھا۔

مذہبی عدم رواداری اور فرقہ واریت کا زور۔ عیسائیوں کے باہم مذہبی اختلافات کا پہلا مظاہرہ مجلس نیقیہ میں ہو چکا تھا۔ اس مجلس نے آریوسی عقیدہ کو مردود قرار دیا تھا۔ حالانکہ آریوس کو مسیح کی الوہیت سے انکار نہ تھا۔ اس کا عقیدہ صرف یہ تھا کہ ایک وقت ایسا تھا جب باپ تھا اور بیٹا نہ تھا۔ یعنی حضرت مسیح ابدیت میں خدا سے ایک درجہ کم ہیں۔ اس جرم میں آریوسی عقائد کے پیروؤں کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا۔ اور آریوس۔ یوسی بیوس اور تھیوگ نس کو سلطنت سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اسی زمانہ

میں نسطور کی تکفیر کا واقعہ پیش آیا جس کے متعلق ڈریپر اپنی کتاب معرکہ مذہب و سائنس میں لکھتا ہے :۔

"عیسوی مذہب میں بت پرستی کے عنصر کی آمیزش کا عمل تو ہر طرف جاری ہی تھا۔ اب ہر بطریق کو ہر دلعزیز بننے یا اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لئے اس بات کی فکر پڑ گئی، کہ جس طرح بن پڑے اپنے معتقدیوں کے عقائد کو عام اس سے کہ ان عقائد کا زمانہ قبل ظہور مسیحیت ہو یا بعد ظہور مسیحیت مذہب میں داخل کر لیا جائے۔ مصریوں نے اسی طرح مسئلہ تثلیث کے متعلق اپنے خاص قسم کے عقائد کو عیسائیت میں زبردستی داخل کر لیا تھا۔ اور اب وہ چاہتے تھے۔ کہ مریم عذرا کی پرستش کے بہانے سے آئی سس کی قدیم پرستش کو از سر نو زندہ کیا جائے۔

انہیں دنوں میں قیصر تھیوڈوسیس نے نسطور کو جو فلسفہ میں تھیوڈور . . . کا ہم مسلک تھا قسطنطنیہ کا بطریق اعظم مقرر کیا (سنہ ۴۲۷ء) اور ان ذلیل تجسیمیہ عقائد سے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے نسطور کو انکار تھا۔ اور اوس کا یہ خیال تھا کہ خدائے ذو الجلال و قیوم کو جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ساری و دائر ہے ذات یا صفات میں انسان کے مشابہ یا مماثل قرار دینا کفر ہے۔ نسطور پر ارسطو کے فلسفہ نے گہرا اثر ڈالا تھا، اور اوس کی یہ کوشش تھی کہ عقائد مشائیہ کو خالص مسیحی عقائد کے ساتھ تطبیق دی جائے۔ اس بنا پر اوس میں اور اسکندریہ کے بطریق سائرل میں جھگڑا ہو گیا۔ سائرل کا تعلق کلیسا کی اس جماعت سے تھا جو بت پرستی کی حامی تھی اور نسطور اس فریق کا سرگروہ تھا۔ جو مذہب کو مطابق عقل ثابت کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ سائرل وہی ہے جس نے ہائی پیشیا کو قتل کیا تھا سائرل نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ حضرت مریم کی پرستش خدا کی ماں ہونے کی حیثیت سے ارکان کلیسا میں داخل ہو جائے۔ اور نسطور کا مصمم قصد تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے صدر گرجا میں نسطور نے ایک خطبہ پڑھا جس میں خدائے قیوم کی صفات کو شرک سے مبرا قرار دیتے ہوئے اوس نے از راہ استعجاب یہ سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے خدا کی ماں ہو . . . . . .

اسکندریہ کے ادنیٰ درجہ کے پادریوں کی شہ پا کر قسطنطنیہ کے پادریوں نے 'خدا کی ماں' کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور نسطور کی مخالفت شروع کی۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ شہنشاہ کو مجبوراً حکم دینا پڑا کہ افیسس میں کونسل منعقد ہو۔ سائرل نے اس اثنا میں دربار شاہی کے صدر خواجہ سرا کو کئی سو مثقال سونے کی رشوت دے کر شہنشاہ کی بہن تک رسائی حاصل کر لی۔ . . . . . اس طور پر سائرل نے ایک دن میں میدان مار لیا اور اپنے حریف کو شکست فاش دے کر خوش خوش گھر پہنچا۔ نسطور نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کہ اس کے عذرات توجہ سے سن لئے جائیں۔ اور جو دلائل وہ پیش کرنا چاہتا تھا ان کو ایک نظر تو دیکھ لیا جائے۔ لیکن اُس کی ایک پیش نہ گئی۔ بجائے اس کے کہ اُس کو صفائی کا موقع دیا جاتا اُس پر قرار داد جرم لگا دی گئی . . . . . . نسطور مورد عتاب ہوا اور جلا وطن کر کے مصر کے ایک ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اوس کے دشمن عمر بھر اس کو ایذائیں دیتے رہے۔"

دو سال کے بعد نسطور کے پیروؤں نے اپنا ایک علیحدہ کلیسا قائم کر لیا۔ اور افیسس کی مجلس کے فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن سرکاری کلیسا کو دنیوی اقتدار حاصل تھا اور نسطوریوں کو شدت سے سزائیں دی گئیں۔ انطاکیہ اور یونانی بولنے والے شامی علاقہ میں ظلم و ستم نے اپنا پورا کام کیا۔ اور نسطوری مصر میں ایک منفرد فرقہ کی حیثیت میں آ گئے۔

۴۸۹ء میں شہنشاہ زینو نے اڈیسہ کے مدرسے کو اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے ارکان نسطوری میلانات رکھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اڈیسہ کے نسطوری اساتذہ اور اہلِ علم بارسوما کی قیادت میں ایرانی سرحد کے پار نقل مکانی کر گئے۔ بارسوما نے ایرانی بادشاہ فیروز کو سمجھایا کہ راسخ العقیدہ یعنی سرکاری کلیسا یونانیوں کا موید ہے۔ لیکن نسطوری بازنطینی سلطنت کے مظالم کی بنا پر اس سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔" اس طور پر نسطوریوں کو ایران میں پناہ مل گئی۔

یہ تو تھا عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں باہمی رواداری کا حال۔ اب یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ عیسائیوں کے اقتدار کے تحت یہودیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ قسطنطین پہلا بازنطینی رومی فرمانروا تھا، جس نے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔ اس بادشاہ نے یہودیوں کے متعلق یہ قانون وضع کیا۔ کہ اگر کوئی یہودی کسی ایسے شخص کو پتھر سے مارے، یا اس کی زندگی خطرہ میں ڈالے، جس نے یہودی مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول کی ہو تو ان تمام لوگوں کو زندہ جلا دیا جا سکتا ہے، جو ایسی کارروائی میں شریک ہوں۔ اس کے بعد ایک قانون یہ وضع کیا گیا کہ کوئی عیسائی یہودی مذہب نہیں اختیار کر سکتا۔ مرنے سے چھ ماہ پہلے قسطنطین نے ایک اور قانون کے ذریعہ یہودیوں کو ممانعت کر دی کہ وہ کسی عیسائی کو غلام نہ رکھیں۔ ڈین ملمین . . . (   ) اپنی کتاب یہودیوں کی تاریخ (   ) میں صفحہ پر لکھتا ہے :-

"قسطنطین کے جانشین نے یہودیوں کے بارے میں جو سخت تر قواعد وضع کئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین عداوت کے جذبات کتنے شدید تھے۔ بدقسمتی سے یہودیوں نے اپنے رویّہ سے حکومت کو اشتعال دلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہودیوں کے جوشیلے نوجوانوں نے آریوسی اور اثناثیوسی فرقوں کے جھگڑوں میں شریک ہو کر ان مذہبی فرقہ وارانہ فسادات کو اور زیادہ ہوا دی جن سے اسکندریہ کی فضا مکدّر تھی۔ انہوں نے بت پرستوں کی طرح آریوسی فرقہ کی طرف میں بڑی سنگدلی اور غارت گری کا مظاہرہ کیا۔ کئی گرجاؤں کو جلا دیا۔ اور بہت سی دوشیزاؤں کی آبروریزی کی۔ جنھوں نے کلیسا کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ اسی زمانہ میں جوڈیا میں یہودیوں نے پھر بغاوت کی جس نے عیسائیوں کے ظلم و ستم کے لئے ایک اور بہانہ فراہم کر دیا۔ یہودیوں پر محاصل کا شدید ترین بوجھ ڈال دیا گیا۔ انہیں منع کر دیا گیا کہ وہ کوئی عیسائی غلام اپنے پاس نہ رکھیں۔ ورنہ انھیں موت کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح عیسائی عورتوں سے بھی شادی کی ممانعت کی گئی۔ شہنشاہ ہیڈریان کے زمانہ کا ایک قانون کو دوبارہ نافذ کیا گیا۔ جس کی رُو سے بیت المقدس میں ان کا داخلہ روک دیا گیا۔

جولین کی تخت نشینی سے یہودیوں کی جان میں جان آئی۔ کیونکہ یہ شہنشاہ بُت پرست تھا اور عیسائیوں کا سخت مخالف لیکن جولین کے جانشینوں نے پھر قدیم عیسائی حکمت عملی کا احیاء کر کے یہودیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ تھیوڈوسیس نے ایک قانون کے ذریعہ فلسطین سے باہر بسنے والے یہودیوں کو حکم دیا، کہ وہ فلسطین کے یہودی بطریق کو سالانہ خراج کی رقم ادا کرنا بند کر دیں۔ اس حکم کی وجہ سے فلسطین میں یہودیوں کی مذہبی سیادت اور مرکزیت کو سخت صدمہ پہنچا۔

ک دنیا اور رہبانیت کا زور۔ اسلام سے پہلے جو تمدن کُش رجحانات کار فرما تھے ان میں سب سے زیادہ نمایاں تصوّر
تھا کہ دنیوی زندگی ایک لعنت ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا انسانی نجات کے لئے ضروری ہے۔ بُدھ مت نے ہندوستان میں
ن رجحان کو اور زیادہ تقویت دی۔ اس نے مذہب کا ترک خواہشات پر دارومدار رکھا۔ اور نروان یا فنائے کامل کو مقصودِ
ت قرار دیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک نہایت وسیع اور منظم خانقاہی نظام کی تخلیق کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں لاکھوں انسان
اپنی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لاکر تمدن کی ترقی اور انسانیت کی خوشحالی میں اضافہ کر سکتے تھے۔ دُنیا اور علائق
یا سے الگ ہو کر خانقاہوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں ریاضت اور نفس کشی کے دن گزارنے لگے۔ ان کے نزدیک انسان خدمتِ
ق کے لئے نہیں بلکہ مراقبہ اور ذکر و فکر کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اور روحانی تسکین و نجات کے حصول کا طریقہ یہ نہ تھا کہ انسانیت کو
ن کی پست سطح سے بلند کیا جائے۔ تمدن کے وسائل کو ترقی دی جائے۔ اور انسانی تعلقات کے نظام کو بہتر اُصولوں پر قائم
یا جائے۔ بلکہ رُوح کی نجات اور تسکین کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ آدمی کسی گوشہ میں بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہے۔ اور زبان۔ کان۔
تھ اور دل و دماغ کے تمام دریچے بند کر کے صرف مراقبہ اور فکر میں دن گزارے۔ عیسائیت نے زندگی کو لعنت تو نہیں قرار دیا
ن اس نے انسان کی پیدائشی گناہ گاری کے تصوّر سے ایک ہمت شکن اور تمدن کش طرزِ فکر پیدا کر دیا۔ بُدھ مت کی طرح
سائیت بھی خانقاہی زندگی کی حامی بن گئی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں مردوں اور عورتوں نے زندگی کے اعلیٰ مشاغل ترک کر دئے
ر اپنی قوتوں کو انسانیت کے فائدہ کی خاطر استعمال کرنے کی بجائے انہیں بالکل مجہول کر دیا۔ اس ضمن میں ہم قسطنطینِ اعظم
مصنف جی۔ بی فرتھ اسکوائر کا حسب ذیل بیان پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ مذہبی عبادات و ریاضات کا یہ
ز دنیا کو کس طرف لئے جا رہا تھا:۔

"کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ رومانی سلطنت میں خاص کر اس کے مشرقی حصہ میں لوگوں کے اطوار بگڑ کر کس درجہ
بیتیں مسخ ہو گئی تھیں اور کیسی بے شرمی اور بدکاری عموماً پھیل گئی تھی۔ اگر قوم کا بحیثیت مجموعی کوئی ایمان تھا تو اس کی قوت
سا س بالکل زائل ہو چکی تھی۔ اب اس کے لبوں پر مہرِ سکوت تھی۔ کوئی نیک ہدایت اس سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔ نیک بخت اور
لیزہ طبیعتیں نازک مزاج بن کر الگ ہو بیٹھی تھیں۔ تمام خرابیوں کو گوارا کر کے مطلق ہاتھ پاؤں نہ ہلاتی تھیں۔ پس اشد ضرورت
، کہ کوئی تحریک ان خرابیوں کے رفع کرنے کے لئے ظاہر ہو۔ آخر کار وہ تحریک ظاہر ہوئی اور مسیحی دین کی شکل میں ظاہر ہوئی۔
لن اس دین کے ماننے والوں میں بہت لوگ ایسے تھے کہ جن گناہوں میں دُنیا مبتلا تھی، ان کو جتا کر خود دنیا چھوڑ بیٹھے تھے اور
شہ نشین ہو کر رہبانیت اختیار کر لی تھی۔ رہبانیت بھی ایسی سخت جس میں انسان کی فطری کمزوریوں کا لحاظ کرنا تو چیزِ دیگر
ا قدرتی ضرورتوں کو بھی جو انسان کے ساتھ لگی ہیں قطعی ترک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان لوگوں میں جن کے مزاج میں
ق بڑھی ہوئی تھی اتنا تو ضرور مانا جاتا تھا کہ ازدواج ایک قابلِ عزت چیز ہے۔ لیکن تجرد کی خوبیوں کو بیان کرنے میں بحدِ غایت
مبالغہ کرتے تھے۔ اور گو خود اس پر عمل نہ ہو، لیکن دوسروں کو سمجھانے میں جس قدر بلاغت و فصاحت میں کمال پیدا کیا تھا

وہ سب اسی مضمون پر صرف کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص بلا افسوس اس تکلیف واذیت کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا جو صدہا بلکہ ہزارہا مردوں اور عورتوں کو اس رہبانیت کی وجہ سے اُٹھانی پڑیں۔ جو اگر بالکل نئی نہ تھی، تو کم از کم سختی میں پہلے سے بڑھی ہوئی تھی سلطنت اور ملکوں کو ان مردوں اور عورتوں کی خدمات کی واقعی ضرورت تھی۔ اور بہت خوب ہوتا کہ ملک ان کی خدمتوں سے مستفید ہوتا لیکن ان لوگوں نے دنیا کے تعلقات سے کنارہ کیا۔ اور تنہائی کے گوشوں میں جا بیٹھے، جہاں انہوں نے یہ نہیں سیکھا کہ اپنے بھائی انسان کی مدد کس طرح کرتے ہیں، بلکہ اس خود غرضانہ حیرانی اور پریشانی میں کہ کسی طرح خود عذابِ آخرت سے بچ جائیں، اپنا خاتمہ کردیا۔ ان سوائے اپنی روحانی نجات کے اور کسی چیز سے بحث نہیں رہی تھی۔"

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے :-

"اس کے ساتھ اس کا خیال بھی رہنا چاہئے کہ ازدواج سے پرہیز کرنا اور اس کی ذمہ داریوں سے بچنا رومانی سلطنت میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ صدہا برس سے سلطنت کو خوف تھا کہ بڑے طبقوں میں بالخصوص یہ خیال قوت پکڑتا جاتا ہے کہ شادی کرکے اہل عیال کا بوجھ اپنی گردن پر لینا درست نہیں۔ چنانچہ رعایا کے اسی میلانِ طبیعت کو بدلنے کے لئے سلطنت کی جانب سے خاص خاص انعام اور محصولات سے معافیوں کے وعدے ہوئے۔ تاکہ لوگ صاحبِ اولاد ہونے سے پرہیز نہ کریں .... اس قسم کے احکام اس اصول پر مبنی تھے کہ انسانی معاشرت کا یہ ایک لازمی فرض ہے کہ انسان شادی کرکے ملک کی خدمت کے لئے اولاد پیدا کرے۔ چنانچہ دربار کے ایک خوش بیان شاعر نے لکھا تھا: قوم کی اولاد سلطنت کی بیج ہے۔ یہی وہ کیاری ہے جہاں سے نئے پودے تیار ہوکر دُور دُور کے باغوں میں لگائے جاتے ہیں۔ یہی وہ باغ جوانی ہے جہاں سے افواج رومانی کے لئے شجاعت و مردانگی کے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ لیکن لوگوں کو لاولد رہنے میں ایسی آسائش معلوم ہوتی تھی کہ گو شہنشاہ جولیان نے اس مضمون کے متعلق بہت سے فرامین جاری کئے، مگر کسی نے کچھ پرواہ نہ کی۔ تاسی تیوس ان فرامین کی نسبت لکھتا ہے کہ ان میں مرض کا علاج مرض سے بھی بدتر بتایا گیا ہے جس نیت سے ایک دُنیا سے متنفر آدمی یا زنا کار بُت پرست بدنی پاکیزگی حاصل رکھنی چاہتا تھا۔ وہ ایک عیسائی کی نیت سے مختلف ہوتی تھی۔ مگر حیرت کا مقام ہے کہ اس بدنی طہارت کو حاصل رکھنے کے لئے طریقہ دونوں نے ایک ہی سا اختیار کیا تھا۔ یعنی شادی کرنے سے بیزاری ظاہر کرتے تھے۔"

انسانی فکر و نظر کا انحطاط ۔ اب تک ہم نے اسلام سے پہلے کے تمدنی اور مذہبی خیالات کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری مہذب دُنیا کا سیاسی، معاشی اور تمدنی نظام ابتر ہوچکا تھا۔ ایک طرف تو دنیا اور مشاغل دنیا میں محویت کی یہ حالت تھی کہ عیش و عشرت ایک فنِ لطیف بن گیا تھا۔ اور بالا طبقوں کو زندگی کی دلفریبیوں میں نہ خدا یاد رہا تھا، اور نہ روحانی فلاح، سعادت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں باقی رہ گیا تھا۔

دوسری طرف غریب، مفلوک الحال طبقوں کو زندگی میں جن مصائب اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس کا ذہنی رد عمل ان پر یہ ہوا کہ وہ دنیا کو ایک لعنت سمجھنے لگے۔ زندگی اور تمدن کو نفرت اور کراہیت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اور روز بروز ترک دنیا

اور لاطائل ریاضات و مجاہدات کی طرف مائل ہوتے گئے لیکن یہ ساری خرابیاں اس فکری زوال کی پیداوار تھیں جو اس زمانہ میں انسانیت پر طاری تھا۔ اس فکری انحطاط میں افلاطونی فلسفہ اور بعض مشرقی مذاہب مثلاً ہندومت اور بدھ مت کے نظریات کا بڑا حصّہ تھا۔ ان اثرات نے مل جل کر نو فلاطونی نظامِ فکر کو جنم دیا، جو اس دَور میں انسانی ذہن پر اتنا حاوی ہو گیا کہ مذہب عیسوی کی پوری تعلیمات اس کے رنگ میں رنگ گئیں۔ یہ تمدن کش راہبانہ فلسفہ دنیا اور انسان کی حقیقت کا منکر تھا۔ مراقبہ اور کشف کو ادراکِ حقیقت کا واحد ذریعہ قرار دیتا تھا۔ وجدان کو حواس پر اور کشف و الہام کو عقل پر ترجیح دیتا تھا۔ اس نے خدا کے ساتھ اتصال اور فنا فی اللہ کا ایک ایسا ہیجل نظریہ پیش کیا جس نے بڑے بڑے علماء، عقلاء اور اعلیٰ صلاحیت کے آدمیوں کو زندگی کی کش مکش اور تمدن کی خدمت سے ہٹا کر تزکیہ نفس میں لگا دیا۔ اس فلسفہ نے نہ صرف مسیحیت کو مسخ کیا بلکہ زمانہ مابعد میں اسلامی تہذیب و تمدن کو بھی زندگی کی حرارت اور تعمیر کے ولولہ سے خالی کر دیا۔ اس کی ابتداء کیونکر ہوئی، اس کی توضیح کے لئے ہم "فلسفہ ابنِ رشد" کے حسب ذیل اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ابنِ رشد، مصنفہ محمد یونس صاحب فرنگی محل۔ صفحات ۲۷۸۔ اور ۲۴۷)

"بطلیموسی خاندان کے فرمانرواؤں مرکزِ علم ایتھنز سے اسکندریہ کو منتقل کر چکے تھے۔ روم بھی مرکز تھا۔ مگر اس کو زیادہ شہرت نہ تھی اسکندریہ میں مختلف عقائد کے لوگ آباد کئے گئے تھے۔ اس بنا پر اسکندریہ مذہب کا سنگم قرار پایا۔ یعنی سامی اور مشرقی مذاہب و خیالات سے پہلے پہل مغربی فلسفہ کی شناسائی ہوئی۔ قیصر کالیگولا کے عہد میں فیلو نامی ایک یہودی اسکندریہ میں درس دیتا تھا۔ اس نے پہلے پہل فلسفہ میں مشرقی مذاہب کے عناصر شامل کئے۔ اس کے فلسفہ کا ماحصل یہ تھا کہ عالم خدا کی ہستی کا ایک جزو ہے، اور مقدس لفظ کُن سے اس کی پیدائش ہوئی۔ یہ لفظ خدا اور عالم کے مابین واسطہ ہے۔ فیلو کے بعد اپالونیس پلوٹارک ...... وغیرہم ہوئے۔ جو سب کے سب گو افلاطون کے مذہب کے پیرو تھے مگر مشرقی خیالات کا ان پر اثر غالب تھا۔ سب کے بعد تیسری صدی عیسوی میں امونیس سیکاس ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے خیالات تمامتر عیسائیت سے اثر پذیر تھے۔ اس نے کشف و مراقبہ کے عنصر کو فلسفہ میں شامل کیا۔ یعنی اپنے فلسفہ کی بنیاد اس بات پر رکھی، کہ علم و ادراک بیکار چیزیں ہیں۔ حقائق عالم کا ادراک محض کشف و مراقبہ سے ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی مسند پر پلاٹینس بیٹھا جو ۲۰۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے فنا و جذب کے مسائل فلسفہ میں شامل کئے۔ یہ سلسلہ افلاطونی فرقہ کے پیروؤں کا تھا۔ اور افلاطونیۂ جدیدہ کے نام سے موسوم تھا۔

" یونانی فلسفہ میں تصوف کی آمیزش پہلے پہل فرقۂ افلاطونیہ جدیدہ کی بنیاد پڑنے سے ہوئی۔ اس فرقہ کا بانی ایک مرتد عیسائی امونیس سیکاس نامی تھا۔ یہ اسکندریہ میں تیسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد اس مسئلہ پر رکھی کہ علم انسان کو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب تزکیہ باطن کے ذریعہ انسان بیرونی اثرات سے یہاں تک مستغنی ہو جائے کہ عالم و معلوم متحد ہو جائیں۔ اس کا خیال تھا کہ عالم میں تین قوتیں جوہرِ مطلق۔ عقل فعال اور قوتِ مطلق کارفرما ہیں۔ انسان کی سعادت یہ ہے کہ مکاشفہ کے ذریعہ اپنے باطن کا تزکیہ کرے کہ عقل فعال سے اس کا اتصال ہو جائے۔ امونیس سیکاس کے بعد اس کا شاگرد پلاٹینس جو ۲۳۳ء میں پیدا ہوا اپنے اُستاد کی مسند پر بیٹھا۔ یہ اکثر روزہ دار رہتا اور عزلت میں بسر کرتا۔ اس کا خیال تھا اس کو اپنی زندگی میں متعدد مرتبہ رویت باری کا شرف حاصل ہوا ہے

اور جو مرتبہ اس کا جسم جسیم خداوندی سے مماس ہُوا۔ اس کے نزدیک دنیا محض خواب و خیال ہے۔ خدا سے اتصالِ کامل انسان کی حقیقی سعادت ہے۔ اتصال بھی اتنا کامل کہ انسان بیرونی اثرات سے پاک ہوکر خدا کے تصوّر میں اپنے تئیں فنا کردے۔ لیکن یہ حالت محض کشف و مراقبہ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان خودی کو فنا کرکے بےخود ہو جاتا ہے۔ اور شخصیت کو کلیت میں فنا کرکے فنا فی الکل کے رتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس بےخودی اور فنا فی اللّٰہی کی حالت میں اصلی حقیقت کے راز اس پر کھل جاتے ہیں۔ اور انسان اس چیز سے متحد ہو جاتا ہے جس میں وہ اپنے تئیں فنا کر رہا ہے۔ یعنی فنا کے رتبہ سے بقا تک اور شخصیت سے کلیت تک اس کو صعود ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی حیاتِ جاودانی اور حقیقی سعادت ہے۔"

افلاطونیہ جدیدہ کے یہ تمام رہبانی اور تمدّن کُش خیالات درحقیقت افلاطون کے نظریہ اعیان سے ماخوذ تھے۔ افلاطون نے تجربہ اور احساسات کی دنیا کو غیر حقیقی قرار دیا تھا۔ اس کی نظر میں حقیقی عالم فوق الحسّی ہے جس میں نہ احساس کا گُزر ہے نہ تجربہ کا۔ یہی دُنیا ہے جس کو وہ عالمِ اعیان یا کلّی تصوّرات کی دُنیا کہتا ہے۔ ہماری روزمرّہ کی حسّی اور تجربی زندگی میں جو اشیاء نظر آتی ہیں ان کی نسبت نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہیں اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ وجود اور عدم کی درمیانی حالت میں ہیں۔ مثلاً کسی حسین شئے کو لیجیے، جس کا ہم اپنے احساسات کے ذریعہ تجربہ کرتے ہیں۔ اس میں حسن کامل نہیں پایا جائیگا۔ بلکہ کوئی نہ کوئی پہلو اس میں بدصورتی اور قباحت کا بھی موجود ہوگا۔ اسی طرح کسی نیکی کو لیجیے جو ہمارے تجربہ میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ بُرائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور لگا ہُوا ہوگا۔ ایسی چیزیں صحیح علم موضوع نہیں بن سکتیں لیکن مجرّد حسن اور مجرد نیکی ایسے ابدی حقائق ہیں جن میں ان کی ضد کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ ان کا کمال ہر نقص سے مبرّا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ کلّی تصوّرات یا اعیان تجربہ کے عالم سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس لئے معلوم ہُوا کہ ایک اور فوق التجربہ عالم ہے، جس کو افلاطون عالمِ اعیان کہتا ہے۔ یہی عالم حقیقی اور علم کا اصلی موضوع ہے۔ افلاطون اپنے اس نظریہ کا اطلاق صرف اخلاقی تصوّرات جیسے حُسن اور نیکی وغیرہ پر ہی نہیں کرتا بلکہ مادّی اشیا پر بھی۔ مثلاً کسی مادّی شئے کو لیجیے، جیسے بلّی۔ کتّا۔ آدمی۔ میز۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم جس بلّی کو دیکھتے اور چھوتے ہیں، وہ ایک مخصوص اور منفرد ہستی ہے۔ لیکن جب ہم بلّی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے کوئی مخصوص بلّی مراد نہیں ہوتی۔ یہ ایک عمومی تصوّر ہے جس کا ہمیں کبھی کوئی حقیقی تجربہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم جو بلّی بھی پائیں گے وہ ایک مخصوص بلّی ہوگی۔ نہ کہ بلّی کا عمومی اور مجرّد تصوّر۔ پس معلوم ہُوا کہ یہ مخصوص اور منفرد ہستیاں مثلاً بلّی۔ کتّا۔ آدمی اور میز وغیرہ اس عمومی اور مجرّد تصوّر بلّی کتّے۔ آدمی اور میز کی مخصوص امثلہ ہیں پھر چونکہ ہم اس مجرّد اور کلّی تصوّر کا کوئی مشاہدہ اور تجربہ نہیں کرسکتے۔ اس لئے معلوم ہُوا کہ اس کا تعلق عالمِ مادّی اور حسّی سے نہیں۔ بلکہ عالمِ اعیان یا کلّی تصوّرات کے عالم سے ہے جو فوق التجربہ ہے اور یہی عالم اصلی اور حقیقی ہے۔ باقی رہا مادّی اور حسّی عالم تو وہ اس عالم کا پرتو ہے جس طرح کوئی بلّی۔ کتّا۔ آدمی وغیرہ جو ہمارے ادراک میں آتا ہے اس مثالی بلّی کتّے اور آدمی کی ایک مثال ہے جو عالمِ اعیان میں موجود ہے۔ لہٰذا تجربہ اور احساسات کے مقابلہ میں عقل جزئیات کے مقابلہ میں کلّیات اور عالمِ مادّی کے مقابلہ میں عالمِ اعیان زیادہ حقیقی اور پائدار ہے۔ مادّی عالم تو آنی و فانی ہے۔ لیکن ابدی حقائق کا عالم لازوال ہے۔

بظاہر یہ فلسفہ بڑا معصوم اور ٹھوس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے عملی نتائج زمانہ ماقبل اسلام میں بڑے خطرناک ثابت ہوئے پہلے تو اس نے ایک ثنویت پیدا کر کے حقیقت کو دو جداگانہ اور مستقل خانوں میں تقسیم کر دیا۔ جن میں سے ہر ایک قائم بالذات اور دوسرے سے غیر متعلق ہے پھر اس نے علم کے لئے حسّی تجربہ کو غیر ضروری ٹھہرایا جس کے نتیجہ میں علم وجدانی کا تصور پیدا ہؤا۔ اس علم کے لئے کسی دلیل و برہان اور تجربہ کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے نہ صرف دنیاداروں اور دینداروں کی وہ تفریق عمل میں آئی جو بالآخر رہبانیت اور ترکِ دنیا کی طرف لے گئی۔ بلکہ اس نے علم ظاہر اور علمِ باطن کی بھی تفریق پیدا کی۔ شریعت اور طریقت کے جو جھگڑے زمانہ مابعد میں مسلمانوں میں پیدا ہوئے، وہ اسی فلسفہ کی پیداوار تھے۔ کیونکہ طریقت کے پیرو ایک ایسے باطنی علم و وجدان اور کشف و الہام کے مدعی تھے، جس کو عقل و دلیل سے ثابت کرنا ضروری نہ تھا۔ ہر شخص یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ فلاں فلاں حقیقت اس نے اپنے باطنی علم اور وجدان کے ذریعہ معلوم کی ہے۔ اس طرح تمام ذاتی توہمات اور شخصی آراء کو مذہب اور عقل کا درجہ حاصل ہو جاتا۔ افلاطونی فلسفہ نے نہ صرف دنیاداروں اور دینداروں کی تقسیم کا آغاز بلکہ خود دینداروں کے دو حصّے کر دئیے۔ ایک حصّہ علمِ ظاہر کا پیرو تھا اور ایک علمِ باطن کا۔ چنانچہ مانی کے مذہبی نظام میں بھی ایک طبقہ خواص کا تھا، اور دوسرا سامعین کا۔ خواص کو گوشت سے پرہیز کرنا پڑتا تھا۔ اور ازدواج سے توبہ کرنی پڑتی تھی۔ اور تمام احساسات و خواہشات کو بالکل کچل دینے کا حکم تھا۔ سامعین پر اس کے مقابلہ میں بہت کم پابندیاں تھیں۔ یہ فرقہ دارانہ درجہ بندیاں بہت سے مشرقی مذاہب میں داخل ہو گئیں اور زمانہ مابعد میں اسلام کے مذہبی نظام پر بھی ان کا اثر پڑا۔ حالانکہ اسلام کے احکام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

علمی حیثیت سے یہ فلسفہ اس لئے تباہ کُن ثابت ہؤا کہ اس نے تجربہ کی ناقدری کر کے انسان کو مجرّد تصورات کا خوگر بنا دیا۔ اس طرح انسان جزئیات تجربہ سے کلیات تک پہونچنے کے بجائے اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ ایک جست میں کلّی حقیقت معلوم کرے۔ تجربہ اور آزمائش کی صبر آزما منزلوں سے گزر کر حقیقت مجردہ اور کلّی تصورات تک پہنچنے کے بجائے وہ من مانے حقائق اور ذہنی صورتوں کے پیچھے پڑ گیا۔ جن کی صحت و صداقت اس کے نزدیک اتنی بدیہی تھی کہ انھیں زندگی کی تجربہ گاہ میں آزمانا اس کو بلا ضرورت معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ کوئی مجرد حقیقت اس وقت تک صداقت کا رتبہ نہیں حاصل کر سکتی، جبتک وہ زندگی کے عملی تجربات میں انسانیت کے لئے مفید مطلب نہ ہو۔ جس چیز کو انسان کی مادّی معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے معیارات پر نہ جانچا جا سکے، اس کی صداقت یا عدم صداقت کا حال کس طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ اور وہ عملی زندگی میں انسان کی کس طرح رہنمائی کر سکتی ہے۔ افلاطون کے نظریہ اعیان کا نتیجہ یہ ہؤا کہ حقیقت اور صداقت کا رشتہ زندگی سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ زندگی تو جزئیات اور احساسات و تجربات کا نام ہے۔ اور افلاطون کے نزدیک حقیقت و صداقت اور علم کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں۔ صداقت و حقیقت اور علم کی دنیا اس دنیا سے مافوق اور بالکل الگ تھلگ ہے۔

اخلاقی زندگی کے لئے افلاطونی نظریات اس لئے تباہ کُن ثابت ہوئے، کہ اخلاقیات کا تمامتر تعلق ہماری مادّی جنسی اور معاشرتی زندگی سے ہے جس اخلاق سے انسان کے معاشرتی تعلقات میں کوئی اصلاح نہ پیدا ہو جس سے اس کے معاشی نظام کی اونچ نیچ اور ناانصافیاں دور نہ ہوں جس سے بین الاقوامی تعلقات اور طبقاتی امتیازات میں کوئی ہمواری اور عدل نہ پیدا ہو آخر اس اخلاق کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن افلاطون کہتا ہے کہ تمام اخلاقی تصورات مثلاً حسن۔ نیکی۔ عدل وغیرہ کا اس عالم سے کوئی علاقہ نہیں۔ ان کی دنیا تو

بالکل الگ تھلگ ہے۔ حالانکہ جو حسن انسانی روابط و تعلقات میں ظہور پذیر نہ ہو۔ جو نیکی پریشان حال اور مصیبت زدہ انسانوں کی چارہ سازی کرنے سے قاصر ہو، اور جس عدل کا مظاہرہ طبقاتی اور بین الاقوامی تعلقات میں نہ ہو سکے، اس حسن، نیکی اور عدل کی حقیقت بہت مشتبہ ہے۔ اخلاقی زندگی کا انسانی تجربات اور جذبات واحساسات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک بے جذبہ ہستی پر ہم اخلاقی اقدار کا اطلاق نہیں کر سکتے۔ ایک بے حس وجود کی روحانیت کیا معنے رکھتی ہے۔

اسی طرح جس چیز کو عقل وجدان اور کشف والہام سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی تجربات واحساسات اور جزئی تصورات کی جڑ و اں میں پیوست ہے۔ عقل جزئیات تجربہ سے بالاتر کوئی مستقل بالذات قوت نہیں۔ وہ انھیں جزئی تجربات کے صحیح تجزیہ اور ترکیب کا نام ہے۔ کشف والہام اور وجدان بھی انسان کے حسّی تجربات کی سرزمین سے چھوٹتے ہیں۔ جو انسان دُنیا ترک کر کے غاروں اور جنگلوں میں زندگی گزارتا پھرے۔ جو ترک علائق کے چکر میں پھنسا ہوا ہو جس نے انسانوں کے باہمی ظلم وستم اور معاشرہ کی نا انصافیوں کا کوئی تجربہ نہ کیا ہو اس کا کشف والہام صرف اس کے جسمانی عوارض کی پیداوار ہو سکتا ہے۔ پھر وہ کون سی وحی، کون سا الہام اور کون سا کشف ہے جو صرف اس دعویٰ پر مشتمل ہو کہ یہ میرا ذاتی تجربہ اور ذاتی کشف والہام ہے۔ میں اس کے لئے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو بلا دلیل میرے دعووں کو ماننا پڑے گا۔ قرآن بھی وحی والہام ہے۔ مگر وہ دلائل پیش کرتا ہے۔ اور نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ طلب کرتا ہے قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (کہو کہ اپنی دلیل لاؤ) مگر یہ دلائل وبراہین ایک ایسی دنیا سے ہی متعلق ہو سکتے ہیں۔ جو تمام انسانوں کے تجربہ میں مشترک ہو جس کو سب افراد بلا استثنا محسوس کر سکیں۔ اگر یہ ایک مشترک حسّی اور تجربی عالم سے متعلق نہ ہو تو ایک آدمی کی دلیل کو دوسرا آدمی کیا سمجھ سکے گا۔ لیکن افلاطون کہتا ہے کہ وجدانی علم اور کلّی تصورات واعیان کا علم ایک ایسے عالم سے متعلق ہے جو مافوق الحس اور مافوق التجربہ ہے۔

غرضیکہ اسلام سے پہلے زمانہ میں عیسویت کی جتنی اخلاقی، علمی اور مذہبی خرابیاں تھیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سب کا ماخذ اور منبع افلاطونی فلسفہ اور نو افلاطونی تصوف ہیں۔

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مصنفہ محمد مظہر الدین صاحب صدیقی

قیمت تین روپے

بیدل

مصنفہ خواجہ عباد اللہ صاحب اختر

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:- سکرٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ لاہور